البقرۃ : 40 [تالیف: بنت عبد الشکور]

يٰبَنِىٓ إِسْرَآءِيلَ اذْكُرُوا۟ نِعْمَتِىَ الَّتِىٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا۟ بِعَهْدِىٓ أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّٰىَ فَارْهَبُونِ

(اے بنی اسرائیل! تم میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور تم میرا عہد پورا کرو، میں تمہارے عہد پورے کروں گا، اور مجھ ہی سے ڈرو-)

چونکہ سورۃ البقرۃ مدنی سورت ہے، اس لئے اِس میں مشرکین اور منافقین کے بیان کے بعد اب یہودیوں کے بارے میں بتایا جا رہا ہے-

یہاں سے خطاب کا رخ عوام الناس کے بجائے بنی اسرائیل کی طرف ہوگیا ہے- اِس آیت (40) سے لے کر آیت: 147 تک انھیں یہ خطاب کبھی انعامات یاد دِلا کر ہے جو اُن پر کئے گئے، کبھی اُن کی بد اعمالیوں پر ڈانٹ کے ساتھ ہے اور کبھی اُن سزاؤں کے ذکر کے ساتھ ہے جو اُن کی نافرمانیوں پر انھیں دی گئیں-

یہ آیات ہمیں بتاتی ہیں کہ جب کبھی کوئی قوم حق سے دُور ہو جاتی ہے تو اُس کی اخلاقی اور روحانی حالت کس طرح سے بگڑتی ہے- اِن آیات میں وہ ہدایات بیان کی گئی ہیں جو کسی بگڑے ہوئے معاشرہ کو سدھارنے کے سلسلے میں ہیں، خاص طور پر ایسا معاشرہ جو اللہ پر اور رسولؐ پر ایمان بھی رکھتا ہو، جیسا کہ ہمارے موجودہ معاشرے کی حالت ہے- قرآن ہمارے لئے آئینہ ہے- جو بھی کچھ اِس میں بیان ہوا ہے اُس سے ہم سبق حاصل کریں- بہرحال بنی اسرائیل اُس وقت کی سب سے افضل قوم تھی- اللہ تعالیٰ نے انھیں بے شمار نعمتیں عطا کی تھیں لیکن انھوں نے اُسکی قدر نہ کی- انھوں نے اپنے رسولوں کو بھی پریشان کیا اور اللہ کے شان میں بھی گستاخیاں کی-

بنی اسرائیل کے کتابوں میں واضح طور پر بتایا گیا تھا کہ آخری نبی کس جگہ آئے گا- اِسی لیے یہودی مدینہ میں بکثرت آباد تھے- اور آخری نبی [محمدؐ] کے بارے میں انھوں نے لوگوں کو خبر بھی دی تھی-

اسحاقؑ سے لے کر بے شمار انبیاء اُنہی میں آئے تھے- اس لیے تمام عرب پر اُن کے علم اور فضیلت کی ڈھاک بیٹھی ہوئی تھی- لیکن جب آخری نبی [محمدؐ] بنو اسماعیل میں سے آئے تو یہودیوں نے اپنے اِس علمی فوقیت کی بناء پر اور اِس حسد سے کہ آنے والا آخری نبی اسحاقؑ کی اولاد سے کیوں نہیں آیا، اسماعیلؑ کی اولاد سے کیوں آیا! اِس لیے انھوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا- یہودیوں میں خاندانی تعصب بہت تھا- حالانکہ اسحاقؑ اور اسماعیلؑ دونوں ابراہیمؑ کے ہی بیٹے تھے-

پچھلی آیتوں سے ربط:-

1> پچھلی آیتوں میں آدمؑ اور ابلیس کا قصہ بیان کیا گیا تھا- اب یہاں بنی اسرائیل پر یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ آدمؑ کی خلافت کے خلاف جس قسم کا غم و غصہ اور حسد ابلیس کو تھا، اُسی قسم کا غم و غصہ اور حسد اللہ کے آخری رسول محمدؐ اور قرآن کے خلاف تم کو ہے- مگر جس طرح شیطان کی دشمنی اور حسد کے باوجود آدمؑ کی خلافت قائم ہو کر رہی اِسی طرح تمہاری دشمنی اور حسد کے باوجود محمدؐ کی رسالت قائم ہو کر رہے گی-

2> پہلے انسان [آدمؑ] جس کو ہدایت دی گئی تھی اُس کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ تفصیل کے ساتھ بنی اسرائیل کا ذکر فرما رہا ہے جنہیں ہم سے پہلے ہدایت دی گئی تھی-

يٰبَنِىٓ إِسْرَآءِيلَ (اے بنی اسرائیل! / اے اسرائیل کے بیٹوں)

"یا" حرفِ ندا (آواز دینے [اے!]) ہے- بَنِىٓ إِسْرَآءِيلَ مرکب اضافی ہے- اِبْنٌ کے معنی اگرچہ بیٹے کے ہیں مگر پوتے اور اُس کی اولاد پر بھی اِس کا اطلاق ہوتا ہے- اِس لیے اِس وقت کے لوگوں کو بھی بنی آدم کہتے ہیں-

اِبْنٌ کی جمع سالم (Sound plural) حالتِ رفع (Nominative case) میں بَنُوْنَ ہوتی ہے اور نصب (Accusative case) و جر (Genitive case) میں بَنِيْنَ ہوتی ہے- یہ جب مضاف بنتے ہیں تو "نونِ اعرابی" گر جاتا ہے- اصل مرکب تھا بَنُوْ إِسْرَآءِيلَ- اِس پر حرفِ ندا "یا" داخل ہوا تو اُس نے مضاف کو نصب دی- اِسطرح یہ بَنِىٓ إِسْرَآءِيلَ ہو گیا- إِسْرَآءِيلَ مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہے اور چونکہ یہ غیر منصرف ہے اس لیے حالت جر میں "ل" پر ایک زبر (ـَ) آئی-

إِسْرَآءِيلَ:

1> یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ کا لقب ہے-

2> یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے- یہ مرکب اضافی اور غیر منصرف ہے- "اِسْرَا" کے معنی بندہ کے ہیں اور "اِیْل" عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے- لہٰذا إِسْرَآءِيلَ کے معنی ہوں گے عَبْدُ اللّٰہِ یعنی اللہ کا بندہ-

یعقوبؑ کے بارہ (12) بیٹے تھے- اِن بیٹوں سے جو نسل (Generation) چلی وہ بنی اسرائیل (اسرائیل کے بیٹے / اولاد) کہلائی-

یہاں یہودیوں کو خطاب کیا گیا کہ 'اے اسرائیل کی اولاد / بیٹوں!' کسی کو اُن کے باپ دادا کے نام سے کیوں پکارا جاتا ہے؟ یہ بتانے کے لئے کہ "دیکھو تمہارے باپ دادا کتنے عظیم لوگ تھے اور تم اُن کی اولاد ہو تو ذرا اپنے بارے میں سوچو کہ تم کیا کر رہے ہو"- اِن آیات میں جیسے کہا جا رہا ہے کہ "دیکھو! یعقوبؑ تو بہت ہی اللہ کے شکر گزار بندے اور آخرت کا بہت زیادہ خوف رکھنے والے بندے تھے- لیکن تم اُن کی اولاد ہونے کے باوجود کیا کر رہے ہو؟!"-

اذْكُرُوا۟ نِعْمَتِىَ الَّتِىٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ (تم سب میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی)

"نعمت" لفظاً واحد ہے لیکن اِس کے معنی جمع کے ہیں- ویسے بھی ایک نعمت میں بھی کئی نعمتیں ہوتی ہیں- مثلاً دِل ایک نعمت ہے لیکن وہ زندہ رہنے کے لیے، خون کی گردش برقرار رکھنے، آکسیجن والا خون جسم تک پہنچانے، آکسیجن سے خالی خون پھیپھڑوں تک بھیجنے وغیرہ کے جو کام کرتا ہے وہ سبھی نعمتیں ہی ہیں- اِسی طرح آنکھیں، ہاتھ، پیر، سارے اعضاء، مال و دولت، صحت، اولاد وغیرہ بھی بے شمار نعمتیں جو ہمیں ملی ہیں لیکن دوسرے اِن چیزوں سے محروم ہیں تو اِن نعمتوں کو یاد رکھ کر اللہ کا زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرنا چاہیئے-

اِبراھیم: 7 ← لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (اگر [میرا] شکر ادا کروگے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا) یہ صرف بنی اسرائیل کے لیے نہیں کہا جا رہا ہے بلکہ ہم سبھی کے لیے بھی ہے-

اللہ تعالیٰ نے بندوں پر جتنی بھی نعمتیں عام کی ہیں چاہے وہ بادشاہت ہو یا دنیا کا مال و دولت ہو یا کوئی اور نعمت ہو، اُن میں اصل سب سے بڑی نعمت دین کی نعمت ہے- اگرچہ بنی اسرائیل کے لیے اللہ نے آسمان سے من و سلوی نازل کیا، اُن کے لیے پتھر سے پانی نکال دیا، آلِ فرعون کی غلامی سے انھیں نجات دی، بادشاہت عطا کی اور بھی کئی احسانات و انعامات سے نوازا لیکن اِن ساری چیزوں سے سب سے بڑی چیز عطا ہوئی وہ دین کی سرداری (Leadership) کا ملنا ہے- بے شمار انبیاء اُن کے اندر آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئی کتابیں ملی- تو خاص طور پر اِن انعامات کو یاد کرو-

جیسا کہ موسیٰؑ نے بھی اُن سے کہا تھا: المائدۃ: 20 ← "اے میری قوم! اللہ کی اُس نعمت / احسان کو یاد کرو کہ اُس نے تم میں انبیاء پیدا کیے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تم کو اِتنا کچھ عطا کیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا-" یعنی صرف دین ہی نہیں بلکہ دنیاوی ترقی بھی عطا کی تھی- اِتنا سب کچھ ملنے کی وجہ سے انھیں اور زیادہ شکر گزاری اور اللہ کی فرمانبرداری کرنی چاہیے تھی لیکن وہ اور زیادہ سرکش ہو گئے-

نعمتیں پا کر انسان یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اُس سے خوش ہے حالانکہ نعمتوں کا ملنا بھی ایک بڑی آزمائش ہوتی ہے کہ انسان اُن چیزوں کا کسطرح استعمال کرتا ہے، وہ اللہ کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بنتا ہے یا نہیں-

وَأَوْفُوا۟ بِعَهْدِىٓ أُوفِ بِعَهْدِكُمْ (اور تم میرا عہد پورا کرو، میں تمہارے عہد پورے کروں گا)

وہ کون سا عہد تھا اِس کی تفصیل سورۃ المائدۃ: 12 میں موجود ہے- اُس کے مطابق اُن کا اللہ تعالیٰ سے عہد یہ تھا کہ تم نماز قائم کروگے، زکوٰۃ دوگے اور میرے رسولوں پر [جن میں محمدؐ بھی شامل ہیں] ایمان لاؤگے، اُن کی مدد کروگے اور اللہ کو اچھا قرض دوگے- اور اللہ کا اُن سے عہد یہ تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور تم سے تمہارے گناہ دُور کروں گا اور تمہیں جنتوں میں داخل کروں گا-

بنی اسرائیل نے اِس اقرار کو قبول تو کیا مگر بعد میں اُس پر قائم نہ رہے- بدنیتی اُن میں پیدا ہوئی- اُن کے علماء نے رشوت لے کر غلط مسئلے بتائے اور حق کو چھپایا- تورات میں جہاں کہیں رسولؐ کی صفات کے بارے میں بتایا گیا تھا اُسے بھی انھوں نے بدل دیا-

وَإِيَّٰىَ فَارْهَبُونِ (اور صرف مجھ ہی سے ڈرتے رہو-)

"إِيَّٰىَ" یہ زور دینے [تاکید / Emphasis] کے لیے ہے- مطلب یہ ہوگا "خاص مجھ سے"-

"فَارْهَبُونِ" اصل میں "فَارْهَبُوْنِى" تھا- اِس میں "یاء" حذف ہو گئی- اِس کا مطلب "تو مجھ سے ڈرو"-

"خاص مجھ سے" کے بعد دوبارہ "تو مجھ سے ڈرو" کی وجہ سے ترجمہ ہوگا "خاص مجھی سے ڈرو" ورنہ خاص کے بعد "مجھ" کا لفظ کافی تھا، "مجھی" کی ضرورت نہ تھی-

اردُو زبان میں اِس اسلوب سے قریب ترین ترجمہ یہ ہوگا "اور مجھ ہی سے، مجھ ہی سے تم سب ڈرو"- یہ نہایت ہی تاکید کا اسلوب ہے-

فَارْهَبُونِ [رھب] ← 1> ایسا ڈر یا خوف جس میں احتیاط اور بے چینی دونوں شامل ہوں-

2> ایسا ڈر یا خوف جو کسی کی عظمت اور جلالت کے تصور سے دِل پر طاری ہو-

رَاھِب لفظ بھی اِسی سے ہے- جس کا مطلب اللہ سے بہت ڈرنے والا، تارکِ دنیا- یہود میں جو لوگ پرہیزگار اور دنیا کی خواہشات سے کنارہ کش ہو کر سادہ زندگی گزارے اور زیادہ توجہ عبادت یا روحانی زندگی پر دے، انھیں "رَاھِب" کہتے تھے-

یعنی تم اگر اپنے آپ کو رَاھِب کہتے ہو تو صرف اور صرف اللہ ہی سے ڈرو- یہاں چونکہ بنی اسرائیل کی بات کی جا رہی ہے اِس لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے، تقویٰ کا لفظ استعمال نہیں ہوا- ہمارے دین نے رَاھِب کے لفظ کو پسند نہیں کیا- ہمارے دین نے مُتَّقِی (پرہیزگار) کہا- لیکن یہ نہیں کہا کہ فلاں مُتَّقِی ہے بلکہ کچھ خصوصیات (Qualities) بتا کر کہا کہ جن میں یہ خصوصیات ہو، وہ مُتَّقِی ہے- اِسی لیے کوئی بھی مومن اپنے آپ کو یہ نہیں کہتا کہ میں بڑا مُتَّقِی ہوں- یعنی بے گناہ، بے عیب، بے قصور، بڑا پاک صاف اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتا ہے- لیکن راھب اپنے آپ کو راھب کہتا ہے- یعنی میں بڑا ہی پاک صاف ہوں اور میرے اندر اللہ کا بہت ہی خوف ہے-

اِس لیے اگلی آیت میں وَإِيَّٰىَ فَاتَّقُونِ (اور مجھ ہی سے ڈرو) وہاں تقویٰ کی بات آئے گی کہ تم راھب نہیں بلکہ مُتَّقِی بنو- بعض علماء نے اِس آیت میں فَاتَّقُوْن کی بجائے فَارْهَبُوْن لانے کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ یہودیوں کے اندر اللہ اور آخرت کا خوف نکل گیا، اُن کے دل بہت سخت ہو گئے، دین صرف رسمی باقی رہا- اور بھی کچھ حکمتیں بتائی- لیکن اللہ ہی حکمت جانتا ہے- ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید کا ہر لفظ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے ساتھ نازل ہوا- اِس میں کوئی بھی لفظ اتفاقاً یا بلا مقصد استعمال نہیں ہوا، بلکہ ہر لفظ اپنی جگہ نہایت درست، مناسب اور حکمت سے بھرپور ہے- اِسی لیے قرآن کا ہر لفظ اپنے اندر گہرے مطلب، اہم پیغام اور بے شمار حکمتیں رکھتا ہے-

خلاصہ:

اِس آیت میں تین کاموں کے کرنے کا ذکر ہے:

1> اللہ کے احسانات / نعمتوں کو یاد کرو-

2> عہد کو پورا کرو-

3> صرف اور صرف اللہ ہی سے ڈرو-

سبق:

اگرچہ اِن آیات میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے، لیکن اِن میں ہمارے لیے بھی بہت اہم پیغام ہے:

1> اللہ تعالیٰ نے ہم پر جو بے شمار احسانات کیے ہیں اُن کو یاد کیجیے، خاص طور پر قرآن اور رسولؐ جیسی بڑی نعمت کو-

2> اللہ کے عہد کو یاد رکھیے کہ صرف اُسی کی عبادت اور اطاعت کرنا ہے، رسولؐ کی پیروی کرنا ہے اور قرآن و صحیح احادیث کے پیغام کو پھیلانا ہے-

3> صرف اللہ ہی کا خوف دل میں رہے، نہ کہ معاشرے، کلچر، لوگوں یا کسی اور کا-

Compiled by: Bint A. Shakoor
(As-Saajidoon)